شذرات

اسرائیلی فوجیں اب تک متحدہ عرب جمہوریہ، اردن اور شام کے ان علاقوں پر قابض ہیں۔ جہاں وہ جنگ بندی کے وقت پہنچ چکی تھیں اور وہ ان علاقوں کو خالی کرنے کیلئے تیار نہیں، جب تک حکومتیں اُن کی شرطیں نہ مانیں۔ اس سلسلہ میں سب سے المناک واقعہ یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت بیت المقدس کے اس حصہ کو جو اردن میں تھا اور جس میں مسجد اقصیٰ، صخرہ اور دوسرے مقامات ہیں، اپنی مملکت میں شامل کرلیا ہے۔ اور یہ اعلان کیا ہے کہ وہ اسے خواہ کچھ بھی خالی نہیں کرے گی۔

انہی دنوں اخبارات میں ایک تصویر چھپی ہے: اس کے پس منظر میں تو مسجد اقصیٰ کی عمارت اور اس کی سیڑھیوں پر اسرائیلی سپاہی دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ اور اُن میں سے بعض کے ہاتھ میں شراب کی بوتلیں ہیں۔ مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کا قبضہ، اس کے دروازہ پر اسرائیلی سپاہیوں کی طرح ہنگامہ برپا کرنا اور اپنی فتح کی خوشی میں نعرے لگانا اور خوش فعلیاں کرنا۔ اس تصویر کو کس مسلمان کا دل خون کے آنسو نہ رو رہا ہوگا، اور اس کے چشم تصور کے سامنے صلیبی جنگ کے وہ واقعات جو وہ تاریخ میں پڑھتا آیا ہے ایک بار پھر پھر گئے ہوں گے گزشتہ جون کے یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔ جس کے اثرات معلوم نہیں کب تک رہیں۔

اس سانحہ پر پاکستان میں جو غیر معمولی درد والم کا اظہار کیا گیا ہے وہ بالکل فطری ہے۔ مسلمانوں پر اسرائیل کی جارحیت کے ہاتھوں جو قیامت ٹوٹی، بحیثیت مسلمان کے ہمارا اس سے متاثر ہونا قدرتی ہے۔ اس کے علاوہ بیت المقدس پر یہودیوں کا تسلط فی نفسہ مسلمانوں کے مذہب پر حملہ ہے کیونکہ بیت المقدس اسی طرح ہمارا ایک مقدس و متبرک شہر ہے جیسے کہ مکہ معظمہ اور مدینہ ہیں۔ اور اس بابرکت شہر کو تو ہمارا قبلہ اوّل ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ اردن اور شام کی تو اسرائیل سے فوجی اور ملکی لڑائی ہوگی، لیکن ہمارے لئے یہودیوں کا مسجد اقصیٰ صخرہ پر قابض ہونا ایک مذہبی مسئلہ ہے، اس لئے جب ہم اس لڑائی کو اسلام اور یہودیت کی قرار دیتے ہیں، تو یہ بالکل صحیح ہے۔ دنیائے اسلام اس لڑائی کو اس نظر سے دیکھ رہی ہے۔ اور اسرائیل بیت المقدس پر اسی طرح قابض رہے تو اسلامی دنیا میں یہودیت اور اس کے حامی ملکوں کے خلاف اتنا شدید ردّ عمل ہوگا کہ مسلمانوں کے فکر و نظر میں ایک بڑا انقلاب آجائے گا۔

ہمارے ہاں کے تمام مذہبی حلقوں میں اور اکثر و بیشتر سیاسی حلقوں میں بھی اس بات پر افسوس ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اگر عرب ملکوں میں عربیت اور عرب قومیت پر اتنا زور نہ دیا جاتا اور عرب قیادتیں تمام دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں اور کثیر التعداد غیر عرب مسلمان ملکوں کے ساتھ بحیثیت مسلمان ہونے کے، عربوں کے جو اسلامی روابط ہیں ان کو بھی تقویت دیتی اور فلسطین کے مسئلہ کو عربی کے ساتھ ساتھ اسلامی بھی بناتیں تو آج پوری دنیائے اسلام ان کی پشت پر ہوتی اور اسرائیل اور اس کے حامی ملک عربوں کو یوں ذلیل کرنے کی جرأت نہ کر سکتے۔

بدقسمتی سے عرب قومیت تمام عربوں کو متحد نہ کر سکی کہ وہ ایک ہو کر اسرائیل کے مقابلہ میں آتے اور اس سے نقصان یہ ہوا کہ اس عرب قومیت کی وجہ سے عرب مسلمانوں اور غیر عرب مسلمانوں میں جذباتی مغائرت پیدا ہو گئی اور فلسطین کے معاملہ میں پوری دنیا کی اسلامی رائے عامہ منظم نہ کی جا سکی، اور یہ مسئلہ صرف عربی بن کر رہ گیا۔

اسلامی دنیائے اسلام متحد ہو اور وہ متحد ہو کر اس پر جو جارحیت ہو اس کا مقابلہ کرے، اس سے بہتر اور کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ گذشتہ ایک صدی میں اس تدبیر کو بروئے کار لانے کی کوششیں ہوئیں لیکن وہ ناکام رہیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں سید جمال الدین افغانی اس پیغام کو لیکر اُٹھے، اور انہوں نے یورپ کی یلغار کے خلاف اتحاد اسلام کے حصار کو مضبوط کرنے کی دعوت دی۔ وہ ایک ایک اسلامی ملک میں گئے لیکن کسی نے ان کی بات پر دھیان نہ دیا، اور دل شکستہ ہو کر راہی عدم ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے ترکوں نے عثمانی خلافت کی زیر قیادت مسلمانوں کو متحد کرنا چاہا۔ اور اس برصغیر میں مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر انصاری وغیرہم نے اس سلسلہ میں ایک زبردست اور ملک گیر تحریک چلائی۔ لیکن اس سے بھی کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ اور جب برطانیہ نے عراق، شام، فلسطین اور خود حجاز پر یلغار قدمی کی۔ اور خود مسلمان اس کی فوجوں میں شامل تھے اور وہ اس کی طرف سے ترکوں کے خلاف لڑے۔ سید جمال الدین افغانی کے بعد اتحاد اسلام کی کوششوں کی یہ دوسری ناکامی تھی۔

ہمارے بزرگ مرحوم و مغفور مولانا عبید اللہ سندھی اتحاد اسلام کے پروگرام کے تحت پہلی جنگ عظیم کے دوران ترک وطن کر کے افغانستان پہنچے تھے تاکہ وہ افغانوں کو ترکوں کی حمایت پر آمادہ کر کے اُن سے ہندوستان پر حملہ کرائیں، لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھی اور

خلافت عثمانیہ جو متحدہ اسلام کا آخری سہارا تھی ختم ہوگئی۔ مولانا سندھی کابل سے جو تو وہاں انہوں نے اتحاد اسلام کے اس مرکز میں ایک انٹرنیشنل مسلم یونیورسٹی اسکیم سوچی اور اس سلسلہ میں وہ ترکی کی ایک مشہور پارٹی کے لیڈر رؤف بے سے مولانا مرحوم کے ساتھی جناب ظفر حسین صاحب اپنی کتاب میں اس کا ذکر کرتے ہو "رؤف بے نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اگر ایسی تجویز انہوں نے اپنے پا میں داخل کی تو جمہوریت خلق پارٹی (اتاترک کی پارٹی) جو ان کی پارٹی پر پہلے ہی ذ پسندی کا الزام لگا رہی ہے، ان پر اتحاد اسلام اور پرانی روایتوں کو پھر زند تہمت لگائے گی اور اس طرح ان کی پارٹی کو ترکی تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہ سے گرا دے

ظفر صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا کو رؤف بے کے اس جواب سے اتنی مایوسی ہوئی عمر بھر کبھی اُن کو اتنا ناامید نہ دیکھا تھا۔ ان کی مسلمانوں کو پھر ایک سلسلہ میں منسلک کر پر پانی پھر گیا تھا اس لئے ان کی بے چینی کی انتہا نہ رہی تھی۔

ترکی قومیت، ایرانی قومیت اور عرب قومیت کی یہ تحریکیں اتحاد اسلام کی ا کی پیہم ناکامیوں کا ردعمل ہیں۔ اور جب ہم ان قومیتوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں تو انصا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے سامنے وہ تاریخی پس منظر بھی رہے جو ان قومیتوں کو فرو باعث اور محرک تھا۔

بے شک انما المؤمنون اخوۃ کے ارشاد کے مطابق روئے زمین کے تما کو ایک رشتۂ اخوت میں پرونا ضروری ہے، لیکن یہ کہ مختلف مسلمان ملکوں اور قو الگ الگ قومیتیں نہ رہیں، اس کا امکان آج کسی نظر نہیں آتا۔ اور جو لوگ اس کی دع ہیں وہ دراصل مسلمانوں سے ریت میں ہل جوتنا اور ان کی کوششوں کو ضائع ہیں۔